© rasailojaraid.com

ٹی۔ کوئیرینگ

شریعت اور جمہوریت

یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام میں امت کے افراد ہونے کی حیثیت سے تمام انسان برابر ہیں' لیکن امت کا یہ شیرازہ نسلی یا برادری کے رشتوں کی بنا پر نہیں' بلکہ اس مذہب کی بنا پر استوار ہے' جس میں خدائے واحد کے وجود کا اعتراف اور اس کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی رسالت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ قوم میں افراد کے وظائف میں تفاوت پایا جاتا ہے مگر خدا کے سامنے کسی جاہ و منصب یا طبقہ و نسل کے امتیازات کے بغیر سبھی ایک ہیں۔ اسلام میں ارفع و اعلیٰ صرف وہ ہے جو زیادہ عابد و پرہیز گار ہے۔ (قرآن) اگرچہ اس عقیدے کا زمانی و مکانی طور پر ایک دوسرے سے جدا معاشروں میں مذہبی اعتبار سے بھی مختلف انداز میں اظہار ہوا ہے' لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس بنیادی عقیدے نے اسلامی معاشرے کا برابر ایک واضح اور مخصوص کردار قائم رکھا۔

تاہم موجودہ سیاق و سباق میں جمہوریت کی اصطلاح کے اس عمومی معاشرتی تصور کو ہی ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے' بلکہ اس کے مخصوص سیاسی معنی کو بھی سمجھنا ہے۔ جس سے ہماری مراد وہ ادارہ یا اداروں کا وہ مجموعہ ہو گا' جو عامتہ الناس کی اپنے آپ پر حکومت کرنے کی خواہش اور بہتر زندگی نیز حسن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرت کے متعلق اپنے گہرے اعتقادات کو موثر معاشرتی اظہار کی شکل دیتا ہے اور ان کو عمل میں لانا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہاں جس چیز سے بحث ہے، وہ جمہوریت کا معاشرتی نہیں بلکہ شہری مفہوم ہے۔

اس بحث کی عمارت بعض بنیادی معروضات پر استوار کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ آزادی جمہوریت کی جان ہے اور جمہوری ادارے اسی آزادی کے اظہار، تحفظ اور ترقی کے لیے معرض وجود میں آتے ہیں۔ یہ صرف اسی قوم میں جنم لے سکتی ہے اور وہیں محفوظ رہ سکتی ہے، جہاں قانون کی حکومت ہو۔ دوسرے یہ کہ قانون کی عظمت کا یہ وہ بنیادی نقطہ نظر اور عقیدہ ہے، جو اصولاً "بحر اوقیانوس، بحر روم اور اسلامی تہذیبوں کو متحد کرتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ مختلف تہذیبیں بنیادی انسانی آزادی اور حکومت خود اختیاری کی خواہش کی تکمیل کے لیے ایک ہی طرح کے سیاسی اداروں کی تشکیل بھی کریں اور آخری بات یہ کہ جمہوریت کو عملی شکل دینے کے لیے دنیا میں جو بھی کوششیں آئندہ کی جائیں گی، ان کے اقدام کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ان تہذیبوں میں قیام امن و آشتی کے لیے باہمی مفاہمت اور احترام ثقافتی روابط ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے رہیں۔ اب اس مجلس مذاکرہ کی خاص حدود کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں اپنے اس عقیدے پر بھی زور دوں گا کہ اگر یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے تو اسلامی شریعت میں ایسے امکانات بھی ملتے ہیں جو ابھی تک بروے کار نہیں آئے اور جن سے اسلامی معاشروں میں جمہوری، سیاسی اداروں کی نشوونما ہوسکتی ہے۔

نظری اور اصل منشا کے اعتبار سے تو بے شک اسلامی معاشرے میں شریعت کو ہر شے پر بالادستی حاصل ہے اور کسی بھی اسلامی حکومت کی انتظامیہ کو شریعت کے احکام و اوامر کے مطابق ہی حکومت کرنی چاہیے۔ مگر واقعیت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخی طور پر (جیسا کہ اکثر اہل علم اعتراف کرتے ہیں) یہ اخلاقی حاکمیت اور یہ فرائض جنھیں سب صحیح العقیدہ مسلمان اصولاً" تسلیم کرتے ہیں' ایسی شہری حکومت اور فرض کا جامہ نہیں پہن سکے کہ ان سے وہ سیاسی ادارے اور آئین وجود میں آتے' جن کے ذریعہ سے قومی جمہوریت کے اخلاقی اصولوں کا موثر اظہار ہوتا ہے۔ اس امر کی تاریخی وجوہ پیچیدہ بھی ہیں اور ہمارے موجودہ موضوع سے غیر متعلق بھی۔ مگر یہ وجوہ ایسی تھیں جنھوں نے اسلام کے جمہوری اصول کی تعمیل و تعبیر کی نشوونما کو عملاً روک دیا۔ اس نشوونما کی تعبیر اور راہ دیکھنے کے لیے دنیاے اسلام آج بھی منتظر ہے۔ یہ شریعت اسلامی کی حقیقت و سچائی کے اعتراف میں خراج پیش کرنا ہے کہ ہرچند اس کے اصول و مبادی کی ملک داری میں ان کے مکمل ظہور کے لیے کام نہیں کیا گیا' مگر اس کے باوجود اسلام کی پوری تاریخ میں انھیں زندگی کے ایک دستور العمل کے طور پر قائم و دائم رکھا گیا اور وہ ایک حد تک جبرو استبداد کی دراز دستیوں کی روک تھام کرنے کا کام دیتے رہے۔

پروفیسر گب (Gibb) نے اپنے مضمون "اسلامک کانسٹی ٹیوشنل آرگنائزیشن" کے آخر میں بڑی خوبی سے اس کی تلخیص کی ہے۔ علامہ دوانی کی کتاب "اخلاق جلالی" سیاسی استبداد کے نشوونما کے ایک خاص موقع پر تصنیف ہوئی تھی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ اگر ہم اسلامی' سیاسی افکار کا مقابلہ ان کلمات سے کریں جن سے کہ ابو یوسفؒ نے ہارون الرشید کو مخاطب کیا تھا تو ہم اس نمایاں استقامت اور استقلال پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے' جسے مسلمان مفکر اپنے اصل مقاصد کے حصول میں اختیار کیے رہے۔ خلافت کی قوت ختم ہو چکی اور مٹ چکی تھی۔ فوجی فاتحین ہر جگہ مسلمان عوام پر حکمران ہو چکے تھے اور ابتدائی ایام میں تغیرپذیر معاشرتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظام کی جگہ سخت طبقاتی امتیازات کا حامل نظام جم چکا تھا۔ لیکن ان تمام انقلابات کے باوجود مسلمانوں کے اصول حکمرانی میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یہی وہ اصول تھے جن کی بنیاد پر سلاطین عثمانیہ اور مغل شہنشاہ اپنے انتظام حکومت کو آنے والی صدیوں میں مرتب کرتے رہے۔ تا آنکہ اندرونی کمزوریوں کے باعث نئے معاشرتی اور سیاسی افکار جو غیر ملکی فلسفے پر استوار تھے در آئے۔"

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، کہ موجودہ اسلامی مجلس مذاکرہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ اس غیر ملکی یا اجنبی فلسفے سے اسلام کے موجودہ رشتے کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرے اور یہ کہ اسلام کے اس فلسفے کے ارتباط کی کیا شرائط ہونی چاہئیں ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ جب ہم پوری طرح غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ فلسفہ اس قدر اجنبی نہیں ہے جس قدر کہ بعض حضرات ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں۔ نیز یہ کہ مغرب اور مشرق میں تعاون کے کچھ ایسے عملی میدان موجود ہیں جہاں کامل صفائی اور دل کی گہرائیوں میں سوچنے سے ہم دیکھیں گے کہ مغرب و مشرق ایک دوسرے کے دشمن ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے شریک ہوسکتے ہیں اور مخالفت کی بجائے باہم موافقت رکھتے ہیں۔

اس غرض اور زیر بحث موضوع سے متعلق مجھے دو تجویزیں پیش کرنی ہیں:

پہلی تجویز سے آپ کو متعارف کرانے کے لیے لارڈ کلمیر کے اس خطبے سے چند فقرے نقل کروں گا، جو انہوں نے گذشتہ موسم سرما میں امریکن بار ایسوسی ایشن کے اجلاس منعقدہ لندن میں پڑھا تھا۔ اس خطبے میں "ٹیپ کا بند" قانون کی بالا دستی تھا اور اس کی اساس آزادی اور جمہوریت پر قائم کی گئی جو اسی یکساں قانون کو ماننے کی بدولت انگریزی بولنے والی قوموں کو میسر ہیں۔ لارڈ کلمیر نے خاص طور پر صراحت کی کہ اس فلسفے کی تہ میں قدرتی قانون کارفرما ہے اور کہا کہ یہ قانون ہمارے اصول قانون میں اس قدر گہرائی میں اترا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا ہے کہ کبھی کبھار ہی ہمیں سطح پر ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہ تمام دوسرے قوانین سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ کیونکہ یہ ساری نوع انسانی کا بہ حیثیت نوع انسانی یا منشائے خداوندی کا اظہار ہے۔ یا پھر انسان کی اعلیٰ ترین عقل کا۔... یہ اس معنی میں فطری نہیں کہ یہ انسان کی ابتدائی اور غیر تہذیب یافتہ حالت سے متعلق ہے۔ بلکہ اس لیے کہ یہ انسانی اقوام و ملل کی مکمل تمدنی ترقی سے مطابقت رکھتا اور ان کے معاشرے کی تنظیم کرتا ہے، جہاں لوگ عقل کی تعلیم کے ذریعے پختہ کار ہو چکے ہیں۔

میں گزارش کروں گا کہ مسلمان فقیہ اور مذہبی پیشوا بہت بڑی خدمت سرانجام دیں گے اگر وہ اس قدرتی قانون کی اہمیت کا احساس کریں اور اس پر زور دیں کہ یہ ایسا ورثہ ہے جو ہم سب کے حصے میں آیا ہے اور جسے ہم نے متنوع ماحول میں اپنی اپنی ضرورتوں کے تحت حسب حال بنا لیا ہے اور ہم اس مشترک عالمگیر قانون کی بناد پر آپس میں اس سے بھی زیادہ تعاون کر سکیں گے، جتنا کہ ہم اس وقت ممکن سمجھتے ہیں۔ مجھے اس بات کو یاد دلانے کی اجازت دیجیے کہ قانون کی بالادستی کا یہ نظریہ ہم نے مشترکہ طور پر ورثے میں پایا ہے اور اگر ہم ماضی کی طرف نگاہ اٹھائیں تو یہی چیز ہمیں قدیم سمیری تہذیب میں ملے گی جس کا اعلیٰ درجے کا لفظی اظہار "قوانین حمورابی" کی صورت میں ہوا۔ اور یہی چیز حضرت موسیٰؑ کی تورات کی بنیاد ہے، جس سے اسلام اور عیسائیت دونوں کے نہال پھوٹے ہیں۔ اگرچہ اس سے دونوں کا رشتہ مختلف طور پر ہوا۔ پھر یہی ورثہ ہے جس نے یونانی اور رومن قانون کی نشوونما میں حصہ لیا۔ ہرچند کہ اس کی مغربی شکل و صورت اس کے سامی رنگ و روپ سے، خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی یا عربی، دوسری طرح تیار ہوئی۔ پھر بھی یہ مشترکہ ورثہ وقت اور محنت دونوں کے اعتبار سے ان تمام حالیہ اختلافات سے زیادہ وزنی ہے جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہماری تہذیبوں کے الگ الگ راستوں پر نشوونما کے باعث نمودار ہوئے ہیں۔ مگر ہم ہیں کہ کوہ پارۂ یخ کی مانند صرف اس چھوٹے سے حصے کو ہی دیکھنا چاہتے ہیں، جو سطح آب سے اوپر اٹھا ہے۔

علاوہ ازیں میں سمجھتا ہوں کہ شریعت اور جمہوریت کے رشتے کو سمجھنے کے لیے یہ چیز بہت زیادہ مدد دے گی۔ اگر ہم اس بات کا تعین کرسکیں کہ خود شریعت میں قدرتی قانون کس حد تک موجود ہے۔ مسلمانوں کی نظروں میں پیغمبر اسلام کا رتبہ نبوت وہی اور قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ اس عقیدے کے احترام و توقیر پر حرف لائے بغیر منطقی طور پر ہمیں یہ توقع کرنی چاہیے کہ منشائے ربانی کے اس جامع انکشاف میں بڑی حد تک وہ سب کچھ ہوگا جو قوانین فطرت کی بنیاد ہے اور یوں پوری انسانیت کے مشترکہ سرمائے کا حصہ ہے۔ اسلام کے بارے میں کوئی بھی نظریہ جو اس کی ہمہ گیری کے جواز میں پیش کیا جائے۔ اسی صورت میں قابل قبول ہو سکتا ہے کہ اس کی جڑ مذکورہ بالا حقیقت میں پیوست ہو۔ وہ لوگ جو عقیدۃً" مسلمان ہیں، ان کے لیے قانون فطرت کا یہ حصہ اس مافوق الفطرت چوکھٹے میں روشن تر اور زیادہ موثر ہو سکتا ہے۔ لیکن اس چیز سے اس امر کی نفی نہیں ہوتی کہ شریعت کا ایک بہت بڑا حصہ قانون فطرت کے مطابق ہوگا اور اس لیے وہ تمام انسانیت کا بھی مشترکہ ورثہ قرار پائے گا۔

جب شریعت کی جڑ یہ قدرتی قانون ہے جو خود منشائے الٰہی کا اظہار ہے اور وہ اس کا اظہار کرتی ہے تو میرے خیال میں یہ خاص وجہ ہے کہ وہ جمہوریت اور جمہوری اداروں کی حمایت اور نشوونما میں دوسرے لوگوں سے اختلاف کے باوجود تعاون کرے۔ ایسے لوگوں میں عملی امور کی سطح پر سمجھوتا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس اشتراک اور عمل کے نظریاتی جواز میں ان کے درمیان اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یہی ادارۂ اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے بین الاقوامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعلان نامے پر ان قوموں کی رضا مندی کی بنا ہے جو اس اعلان کی پابند ہو گئی ہیں۔ ایک جماعت ماہرین، جس نے ایسے عام اور عالم گیر حقوق پر بحث کی، اگرچہ اس نتیجے پر پہنچی کہ ان حقوق کی اصل پر اتفاق ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی ایک دوسرے سے یہ سوال نہ کرے کہ وہ ایک دوسرے سے متفق کیوں ہوئے؟ فلسفی جیکواس مارٹن نے اس جمہوری اعلان نامے یا منشور کے متعلق بحث کرتے ہوئے جس پر ہم سب کو متفق ہونا چاہیے، صحیح کہا ہے کہ "گو مختلف بلکہ متضاد مابعد الطبعیاتی یا مذہبی نقطہ ہائے نظر رکھنے والے لوگ کسی نظریاتی وحدت کی بنا پر مجتمع نہ ہو سکیں، لیکن عملی اصولوں میں مشابہت اور مماثلت کی بنیاد پر مشترکہ عملی مقاصد کے لیے متحد ہو سکتے ہیں اور ایک ہی قسم کے غیرمذہبی اعتقاد میں حصہ دار بن سکتے ہیں، بشرطیکہ سچائی، ذہانت، انسانی وقار، آزادی، برادرانہ محبت اور اخلاقی نیکی کی مطلق قدر کا احترام کرنے میں ہم خیال ہوں۔ اگرچہ احترام کا سبب شاید بالکل مختلف ہو۔

مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے سے اس بات پر کچھ اختلاف رائے رکھ سکتے ہیں اور یہ دونوں خالص عقلیت یا انسانیت پرستی کا عقیدہ رکھنے والوں سے اور بھی زیادہ جمہوری منشور اور قومی خود اختیاری حکومت کے حتمی جواز پر اختلاف کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ چیز اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ ہم سب مناسب معاشرتی و سیاسی اداروں کی شکل میں لوگوں کی اپنی پسندیدہ حکومت قائم کرنے کے حق کو پایہ تکمیل تک پہنچانے پر متفق نہ ہو سکیں اور اس عام انسانی حق پر اصرار نہ کریں۔ یہ درست ہے کہ اسلامی شریعت اپنے احکامات کی مکمل تعمیل کے لیے اس سے زیادہ کی مقتضی ہو سکتی ہے لیکن یہ مشکل ہی سے ہو گا کہ اسے حکومت پر (خواہ قوم کی اکثریت اطاعت گزار مسلمانوں پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو۔) مذکورہ بالا شرط پوری ہوئے بغیر کامل اقتدار حاصل ہو جائے۔ یعنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانی اور دنیاوی سطح پر حکومت خود اختیاری پر اتفاق رائے اور عمل کرنے کے بعد ہی شریعت کے دوسرے تقاضے پورے کیے جاسکتے ہیں۔ یہ تاریخی حقیقت کہ شریعت اب تک کبھی پوری طرح اپنی فوقیت قائم نہیں کرپائی' اگرچہ اس نے سیاسی نظاموں کو اپنے اصولوں کے مطابق کسی حد تک ضرور بدل دیا' دنیائے اسلام کو بظاہر اس تجربے کے لیے آمادہ کرسکتی ہے اور میرے خیال میں یہ چیز عمل میں بھی آسکتی ہے' بغیر اس کے کہ ان مذہبی اصولوں میں کسی قطع و برید کی نوبت آئے۔ درحقیقت یہ کام انہی اصولوں کو ایک ایسی حد تک عمل میں لانے سے ہوگا' جس حد تک ہنوز ان پر عمل نہیں ہوا ہے۔

یہاں تفصیل سے کسی ایسے جمہوری منشور کے نفس مضمون پر بحث کی گنجائش نہیں' جس کی تشکیل اور تعمیل کے لیے مسلمان علماء' فقیہ رہنما اور سیاست دان آپس میں اشتراک اور توجہ مرکوز کرسکیں۔ متحدہ کوششوں کے اس میدان کی نوعیت کے بارے میں اشارے کے طور پر میں پروفیسر مارٹین کی کتاب "انسان اور ملک" کا ایک اقتباس دوں گا: "اس قسم کے منشور میں کچھ اس قسم کی چیزیں شامل ہوں گی۔ شخصی حقوق اور آزادی' سیاسی حقوق اور آزادیاں' معاشرتی حقوق اور آزادیاں اور انھیں کے مطابق فرائض۔ ایسے لوگوں کے حقوق اور ذمے داریاں جو ایک کنبے کا حصہ ہوں اور پھر اس کنبے کی ملکی سیاست کے متعلق ذمہ داریاں اور آزادیاں' پھر گروہوں کے باہمی حقوق و فرائض اور ملک سے متعلق حقوق و فرائض بھی شامل ہوں گے۔ ایسی حکومت عوام کی حکومت ہوگی' اس میں عوام ہی حکمران ہوں گے اور وہ عوام ہی کے لیے ہوگی۔ سیاسی اور معاشرتی جمہوریت میں حکومت کے وظائف پھر منصفانہ قانون اور آئین ریاست جو عوام کی آزادیوں کی حفاظت کرتا ہو۔ دل سے پابندی کی اخلاقی ذمہ داری۔ ایسے معاشرے میں جو حقیقتاً آزاد ہو' اور جس پر ایسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوانین کی حکومت ہو، جن میں عوام کی اکثریت کی مرضی سے تبدیلی اور ارتقا ہو۔ انسانی مساوات، افراد اور ملک کی سیاسی ہیات میں منصفانہ تعلقات شہری دوستیاں اور اخوت کا نصب العین مذہبی آزادی ہو باہمی رواداری اور باہمی احترام، مختلف مذہبی بنا پر استوار ہونے والے فرقوں اور فلسفوں کے درمیان شہری وفاداری اور وطن کی محبت، وطن کی تاریخ اور اس کے ورثے کا تقدس اور وطنی وحدت کو پیدا کرنے والی روایات کا شعور، ہر فرد پر حیات سیاسی کے مفاد کی ذمہ داری اور ہر قوم کی پورے مہذب معاشرے کا لحاظ رکھنے کی ذمہ داری اور اس بات سے واقف ہونے کی ضرورت کہ ساری دنیا واحد چیز ہے، اور اس میں اقوام کی ایک بستی آباد ہے۔"

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کے رہنما اپنے فوری مستقبل کے لیے اپنی کوششوں کو اس چیز پر مرکوز کر دیں کہ وہ صبر و تحمل سے موجودہ قانونی ڈھانچوں پر نظرثانی کریں (جو اکثر بغیر مناسب ردوبدل کے یورپ سے مصنوعی طور پر لے لیے گئے ہیں) تاکہ لوگوں کے حقوق و فرائض کو مذکورہ امور کے سلسلے میں صحیح شکل دی جائے اور انھیں مسلمانوں کی مخصوص روایات و ضروریات سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو ایک ایسی وسیع اور مضبوط بنیاد ہاتھ آسکتی ہے، جس کے اوپر اسلامی قانون کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے، جو زیادہ قطعیت کے ساتھ اسلامی شرع کے مخصوص عقائد کا اظہار کرے گی۔ جو کچھ میں نے کہا ہے، یہ قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ اس بات کی وضاحت سورۃ شوریٰ (۴۲) کی آیت سے ہوتی ہے۔ والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوٰۃ وامرھم شوریٰ بینھم و مما رزقنھم ینفقون (۳۹:۴۲) اور وہ لوگ جو خدا کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اپنے معاملات کا فیصلہ آپس میں صلاح و مشورہ سے کرتے ہیں اور وہ جو دوسروں کو اس میں سے دیتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، جو ہم نے انہیں عطا کیا ہے۔

شریعت اور جمہوریت کے بارے میں اپنی دوسری تجویز کا میں صرف اجمالاً ذکر کروں گا اور اس کی شرح یا وکالت اس وقت نہیں کروں گا۔ یہ تجویز جمہوریت کے موثر فروغ کے لیے ایسے وسائل کے بارے میں ہے، جن کے متعلق لوگوں میں وسیع طور پر ذمہ داری کا احساس پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو یہ چیز اگر سراسر واہمہ نہیں تو کم از کم غیر حقیقت پسندانہ دکھائی دے سکتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں یہ استدلال کرسکتا ہوں کہ تاریخ میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ میری مراد شریعت کو سمجھنے اور اس کو عمل میں لانے کے لیے، کہ وہ جمہوری اداروں اور صحیح معنوں میں اسلامی معاشرے کی ترقی کا باعث بن سکے، اجتہاد کے جمہوری استعمال سے ہے۔

پرنسٹن میں جو مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی تھی، مجھے اس میں یہ چیز نمایاں طور پر نظر آئی کہ اجتہاد کی اہمیت پر بالخصوص اہلسنّت نے بہت زیادہ زور دیا۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ گو ایک مدت تک اس مسلمہ نظریے کا غلبہ رہا ہے کہ اجتہاد کے دروازے بند ہوچکے ہیں۔ لیکن آج کے مسلمانوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے تقاضوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے لیے اجتہاد سے کام لینا لازم ہے۔ یہاں میرا سوال صرف اتنا ہے کہ کیوں نہ اسلام کے اس ابتدائی نظریے اور قابل ستائش عمل کی حوصلہ افزائی کی جائے؟ اور یہ تجربہ صرف عالم رہنما ہی نہیں، عام مسلمان بھی کر دیکھیں، کیونکہ یہ چیز ان کی تعلیم کے لیے نیا محرک ہوسکتی ہے اور قرآن اور شریعت کو تعلیم میں مرکزی حیثیت دے سکتی ہے۔ نیز اسلامی ملت میں نئی انقلابی قوتوں کو وجد میں لاسکتی ہے۔ اس عمل کے ذریعے ایسے عوام تربیت پاسکتے ہیں جو سچی جمہوریت کے حقوق سے متمتع بھی ہوسکیں گے اور اس کے فرائض بھی ادا کرسکیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تجویز پر کچھ اور کہنے کے لیے ایک الگ مقالے کی ضرورت ہوگی اور میں نہیں چاہتا کہ سامعین کے حسن اخلاق سے اتنا کچھ فائدہ اٹھانے کے بعد مزید گرانی کا باعث بن جاؤں۔

ماخذ

۱۔ لا ان دی مڈل ایسٹ (Law in The Middle East) مولفہ ایم خاودری و ایچ جے بزنی (واشنگٹن ۱۹۵۵ء، ص ۲۷)

۲۔ لائف (میگزین) ۵ر اگست ۱۹۵۷ء، ص ۲۰

۳۔ مین اینڈ سٹیٹ (Man and State) مطبوعہ لندن ۱۹۵۴ء، ص ۱۹۱

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۲

© rasailojaraid.com